

اسکھی انقلاب

مولانا وحید الدین خان مدظلہ العالی

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملت آدم میں شرک کا غلبہ ہو گیا (البقرہ ۱۲۳) حضرت نوح اسی وقت آدم کی اصلاح کے لئے آئے جو اس وقت دجلا و فرات کے سرسبز علاقہ میں آباد تھے۔

تمام حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو سکی۔ حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ فرق کر دئے گئے۔ اس کے بعد ملت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون ۴۴) مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتیٰ کہ تمام پیغمبروں کو استہزاء کا موضوع بنالیا گیا (الیسین ۳۰)

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اس زمانہ کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات قوی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہوا وہ شرک کی فضا میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو جانے سے تعبیر کیا ہے، ماورہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعائیں ان الفاظ میں ملتی ہے: ولا یلدوا الا فاجرا کفالا (نوح ۲۷)

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ ۲۱۰۰ قبل مسیح ہے۔ خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت بشرق الہی نے انسان کی ہدایت کے لئے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصاً اہتمام کے ذریعہ ایک ایسا نسل تیار کیا جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے۔ اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لئے توحید کو قبول کرنا آسان ہو جائے۔ پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو مکہ ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر

قدیم کر کے غیر آباد علاقہ میں جائیں۔ اور وہاں اپنی بیوی باجرہ اور اپنے شیرخوار بچے اسماعیل کو بسا دیں یہ علاقہ وادی غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں بالکل غیر آباد تھا۔ اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔ حضرت ابراہیم کی دعا (۱۲۷) میں عندا بیتک الحرام سے بھی چیز مراد ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا، میں نے اپنی اولاد کو ایک بالکل غیر آباد علاقہ میں بسا دیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہو رہی ہے، راقم الحروف ایک ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقہ میں رہائش اختیار کر لی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس روکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لن گویا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان پوتوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات ۱۰۲) دکھایا گیا وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے ہی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیر عمل لایا جاسکتا تھا جہاں اسباب حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو۔ حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبہ کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ بچوں کو اسباب کے دائرہ میں زیر عمل لانا تھا اس لئے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی رہی۔ حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی بھی اس کی جانچ کے لئے کب جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف باجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے

کچھ خانہ بدوشش افزا دیہاں اگر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل جڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک روکی سے شادی کر لی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بازنطینیوں سے چل کر کہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے۔ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غیر عتبۃ بابک) حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ کچھ گئے کہ میرے والد تھے اور ان کا پیغام تمہیں کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کر لوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کر لی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی ماں بن سکے۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ کہ آئے۔ اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔ اس سے حال پوچھا تو اس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثبت عتبۃ بابک) حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو کچھ گئے کہ میرے والد تھے اور ان کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبہ سے مطابقت کر کے رہ سکے اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح مہرائے عرب کے الگ خٹک ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک الفطرۃ اور دوسرے المردۃ۔

مہرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔ کھلے بیابان، اونچے پہاڑ، رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے وغیرہ۔ اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور کاریگری کی یاد دلاتے تھے۔ اسی خالص ربانی ماحول میں پرورشش پاکر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ ۱۲۸) بن سکے۔ یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لئے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لئے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے

جس عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ احوال میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کارآمد ہو سکتے تھے۔ وہاں بیرونی احوال میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے احوال میں قدرتی طور پر ایسا ہونا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیر و ہون کی ایک ایسی زسری (Nursery of heroes) میں تبدیل ہو گیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

چھٹی صدی عیسوی میں وہ وقت آگیا تھا کہ شارحین میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا کرنے کا مقصد اعلیٰ اللہ کے حکم سے تھا۔ یہاں تک کہ ان کے الفاظ آئے ہیں: **هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره الكافرون** (الصف) یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبے کے مقام سے ہٹا دیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کر دیں۔ اس غلبے سے مراد اصلاً فسکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی ہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہوگی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبہ کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی دفت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جدوجہد کے بعد ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کنتہم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰) میں ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجے میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف وہ اپنی تخلیق فطرت پر قائم تھا۔ دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورۃ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشہور سلطنتیں تھیں۔ ایک رومی (بازنطینی) سلطنت، دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔ اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہ راست یا بواسطہ طور پر انہیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔ توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لئے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیشش آنا لازمی تھا۔ خدا نے یہ کیا کر عین اسی زمانہ میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تھس تھس کر کے ان کی حکمت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

The enfeebled condition of the rival Byzantines and Sassanids who had conducted internecine wars against each other for many generations, the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and undermining their sense of loyalty... all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms.

Philip K. Hitti, History of the Arabs, London 1970, P. 142-43

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسل تک جاری رہا۔ اس کا نتیجہ پورا کرنے کے لئے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبعی واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لئے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔ ایک امریکی انسائیکلو پیڈیا میں ”اسلام“ کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں

شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبہ کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب تو بہائی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی انیٹار کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی مکرانی کی جگہ جمہوری مکرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تنقید کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس شہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت نہ کریں۔ (سورہ ابراہیم ۳۶)

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (انصام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریکی طور پر شناخت ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو مذہب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس

۱۰۔ چاند اور ستارے ہر آنکھ کو مل جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگہ گاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے قریب میں آ گئے

اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکری پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتیں بھی انہیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بت کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت تک توحید کا جو مضبوط بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں قاتل وہم حتی لا تکنون فتنۃ و

میکون الدین کہلہ اللہ (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارج ہے۔

تدین زمانہ میں شرک کو جاہلیت کا موقع اس لئے حاصل تھا کہ اس زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہو گئی تھی۔

شرک و عمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے

ظلموں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ دعوت ان کے حق مکرانی کو مستحکم کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں

کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ قدیم زمانہ میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم بردارانِ شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاکہ کر دو کہ وہ ادیانِ توحید کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناسکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے یہ ہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقہ میں مشرکانہ نظام کو مطلوب کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاکہ کر دیا گیا اب ہمیشہ کے لئے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی ہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: **مَنْ يُضْمِرْ هِمًّا آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي الْغُيُوبِ فَهُوَ يَتَّبِعُ الْآيَاتِ بَعْدَ الْأَفَاقِ وَهُوَ يَتَّبِعُ الْآيَاتِ بَعْدَ الْأَفَاقِ وَهُوَ يَتَّبِعُ الْآيَاتِ بَعْدَ الْأَفَاقِ** (مجم الجہدہ ۵۳) پہلے مرحلہ کا انجام پایگیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ نظامِ فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علم کی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دورِ نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں مکمل ہوا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات سے ایک سبب سے بیانِ موقوفات کے آئینہ میں آدمی اس کے خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کر کے کہتا ہے کہ اس نے دنیا کی چیزوں کو پر اسرار طور پر مقدس بنا رکھا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں کچھ تو باقی عقائد میں آتے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی حقیقت جو سبب میں آتے تھے۔ تو یہاں کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارے میں تقدس کا ذکر ختم ہو گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی۔

اس حقیقت اور مطالعہ کے نتیجے میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو عظیم نظام کا رفراب وہ انسان کے سامنے آئے۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشین گوئی کا منہ صورت میں پوری ہو گئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (مجم الجہدہ ۵۳) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انہوں نے ہمیشہ کے لئے توہماتی دور کا خاکہ کر دیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ معلومات ایک مومن کے لئے اضافہ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا وہ بن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ آدمی کو اس درجہ احسان تک پہنچا دے جس کو حدیث میں تعبد اللہ کا تک ترہ (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) کہا گیا ہے۔

دو جدید میں احیاء اسلام

موجودہ زمانہ میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔ اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجہ کے دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں پیدا ہو، وہ طہرانہ افکار کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ الحاد آج کا غالب دین ہے۔ اور اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو کوکری غلبہ کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کو ممکن بنانے کے لئے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے غلبہ کے وقت اختیار کئے گئے تھے۔ یعنی افراد کی تیاری۔ اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔

پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانہ میں دوبارہ خدانے اسی طرح بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دور اول میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی ہم کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔

موجودہ زمانہ میں اسلامی احیاء کی ہم چلانے کے لئے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے اسلام ایک دریافت (Discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ ہی دریافت کا واقعہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، مردانگی، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لئے درکار ہیں وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔

مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابل میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دئے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

قرن اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابل میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابل میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ ان پر دنیا کے مقابل میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دئے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج اگر اسلامی ایوارڈ کی ہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہونہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔

۲۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے

شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں نہ کہ حقیقتہً قرآن اور سنت رسول ت۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لئے فخر کی چیز بننا ہوا ہے نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا شاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کو قرآن و سنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسکولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اسلام کو عیب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئین میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اس جذبہ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قومی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہو گئیں۔ کیونکہ فخر کا جذبہ نائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسکولیت کا جذبہ حقیقی اور سنبیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی ایوارڈ کی ہم کو موثر طور پر چلانے کے لئے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن و حدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ سے۔ قرآن و حدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی ہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (Persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور فتح پور سیکری" میں اپنی اسلامیت کا

تخصّص دریافت کیا۔ چونکہ موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لئے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے جھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا اس لئے جب وہ چھین گئی تو ہم شکایت اور محرومی کا پسیر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھیننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آ رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھینی ہوئی محفوظ ہے اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چیز ہم سے چھین گئی ہے اس کے لئے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ انہیں اس عظمت کو چھیننے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے خلاف وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لئے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھینے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیاء کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آچکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں نہ کہ مادی حریف اور قومی رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم ایک طرف طور پر تمام شکایات کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے ایک طرف قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی ہم کے لئے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں دوبارہ اسی قسم کا

ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران ۱۱۰) کے لئے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آئین فضا میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادی غیر ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہوگی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لئے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت کے اعلیٰ معاشی مواقع سے محروم کر کے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعین باشندہ اور قرآنت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ مقلوب جی کے مذکورہ الفاظ میں دوبارہ ایک قسم کی ”نرسری آف ہیروز“ بنانے کے ہم معنی ہوگی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابلِ لحاظ ٹیم تیار نہ ہو جائے، احیاء اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔

اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہوگی —
 وَلَوْ لَا نَفَرٌ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلَيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کر کے ایک علیحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم و تربیت کے ذریعہ انہیں اس کے لئے تیار کر دیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی ہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ وہ اہل عالم کے لئے مندر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم کمر کرتنا کمزور کر دیا کہ اہل اسلام کے لئے ان کو مغلوب کرنا آسان ہو گیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارہ میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانہ میں تو ہمانی طرز فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارہ میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلِ رب (کرشمہ خدا) خدا کہا گیا ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ تو ہمانی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اول کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرترش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لئے تحقیق و تمیز کا موضوع بن گئے اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعات فطرت کو خالص علمی انداز میں

جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پا کر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا تو ہماری پردہ کو ہٹا کر شہ خدا کا کرشمہ خدا ہونا ثابت کر دیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو ”معبود“ کے مقام سے ہٹا کر ”خلوق“ کے مقام پر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ یہ ثبوت آئی کہ خدا جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دئے اور وہاں اپنی نشینیں اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے ہونے والے فرام کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جاسکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے محضرات ظاہر کئے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انہیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانہ میں خدائی کا ثبوت ہے۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انہوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انہوں نے اس بات کا ثبوت بنا دیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک شین علی کے تحت اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ با معنی اور با مقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بننے والی بنا رہی ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کا تمام جینز بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ با مقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں نظم اور مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کار فرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کا رخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بھائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (End) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (Effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادہ کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واقعات کے بے شعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے با معنی بھی ہو۔ یہ بے معنی تو یہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کبھی عجیب بات ہے کہ با معنی کائنات کو بلا ارادہ کار فرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد علمد مفکرین نے بہت بڑے پیمانے پر سائنس کو الحاد کا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتے ہیں جن کے ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی مفکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سر جیمز جینز کی پر اسرار کائنات (The Myterious Universe) ہے۔ اس کتاب میں لائق معصف نے نظریہ تفسیل (Principle of Causation) کو خاص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا شین بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت بڑے پیمانے پر سائنس کی معلومات کو دینی صداقتوں کے انبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو سکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتداء میں یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا (عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً) اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گذر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم و اعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ”معلوم نہیں یہ واقعہ پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں“ اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لئے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔ اس کے حق میں مسلم تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس بعد کے مرحلہ تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔

کیوں کہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے۔ دوسرے انبیاء اپنے زمانہ میں لوگوں کے لئے اس لئے نرالی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے، بعد کے دور میں وہ دوبارہ نرالی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے سیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبرِ آخر الزماں کا استغفار ہے۔ آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نرالی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصہ میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ پیغمبرِ آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاجح رہے۔ آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔ جو طاقت بھی آپ سے محروم ہوئی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی باہر معاشرہ تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نرالی مرحلہ سے مکمل کر محمدی مرحلہ میں پہنچ گئی۔ آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لئے آپ کے بارہ میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانہ میں دینِ حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (Advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعیِ گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلمہ (Established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (Controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جاسکتی تھی۔

دوسری باتیں اگر نبوتِ نرالی کی وارث تھیں تو، ہم نبوتِ محمدی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوامِ عالم کے سامنے شہادتِ حق کا جو کام انجام دینا ہے اس کے لئے خدا نے آج ہر قسم کے موافق مواقع مکمل طور پر کھول دیے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کارِ شہادت کو انجام نہ دیں۔ یا شہادتِ دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ ربِّ العالمین کے سامنے کیوں کمرِ بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۳ء کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمینار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیرِ نظر مقالہ اسی سیمینار میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔